© rasailojaraid.com

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

ایک خاکہ

مولانا امتیاز علی خاں عرشی برصغیر کے نامور عالم اور محقق تھے۔ رضا لائبریری رام پور (ہندوستان) کے ناظم اور معروف مصنف تھے۔ انھوں نے ۲۴ اور ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء کی درمیانی شب کو وفات پائی۔ "المعارف" کے اپریل اور مئی ۱۹۸۱ کے شماروں میں ان کے بارے میں چند باتیں بیان کی گئی تھیں — اب اپریل تا جون ۱۹۸۲ء کے سہ ماہی "العلم" (کراچی) میں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کا ایک مضمون ان کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی زندگی کے بہت سے حسین گوشوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ یہ مضمون "العلم" کے شکریے کے ساتھ "المعارف" میں شائع کیا جا رہا ہے، تاکہ ہمارے قارئین کرام بھی اس سے مستفید ہو سکیں اور "المعارف" کے ذریعے جو باتیں ان کے علم میں نہیں آئیں، وہ "العلم" کی وساطت سے آجائیں — (ادارہ)

میں رتن ناتھ سرشار پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام کا آغاز کر چکا تھا۔ سرشار کی بعض کتابیں فراہم نہیں ہو رہی تھیں۔ ان کی مطبوعہ کتابوں کے اوّلین نول کشوری ایڈیشن بھی نہیں مل رہے تھے۔ میں سراسیمہ اور پریشان تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں لکھنؤ گیا۔ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی اور لکھنؤ کے مختلف کتب خانوں میں سرشار کی مطبوعہ کتب تلاش کیں، نول کشور پریس بھی گیا، مگر وہی ڈھاک کے تین پات، خرچ اور پریشانی کے باوصف خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ایک دن نیاز فتح پوری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے راجا محمود آباد کے کتب خانہ میں مطلوبہ کتب تلاش کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر اس وقت کے ہنگامی حالات میں راجا محمود آباد کے کتب خانے سے استفادہ نہیں کیا جا سکا۔ میں لکھنؤ میں دو ہفتے گزارنے کے بعد بریلی واپس آیا اور پریشانی و مایوسی کی کیفیت میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ مجھے سرشار کی فلاں کتابوں کے اوّلین نول کشوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایڈیشن دو کار ہیں۔

اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ رضا لائبریری رام پور ایک بڑی لائبریری ہے اور اس کے ناظم مولانا امتیاز علی خاں عرشی ماہرِ غالبیات عام سطح سے بالا بہت ہی درخشندہ شے ہیں۔

مولانا عرشی نے میرے خط کا جواب بلا تاخیر بھیجا جو گویا ان سے پہلی غائبانہ ملاقات تھی اور وہ بھی اس قدر مستحکم کہ آج تین دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی ذہن کو متاثر کیے ہوئے ہے۔ میں نے اپنے خط میں مولانا عرشی سے جتنی باتیں دریافت کی تھیں بس ان ہی کا جواب بھیجا گیا تھا۔ نہ کوئی سطر زیادہ اور نہ لفظ۔ آں موصوف نے مجھے جن الفاظ سے مخاطب کیا وہ گویا ایک اکیس برس کا جوان نہیں، ایک بارتبہ محقق تھا، جب کہ انھوں نے خود اپنے لیے "احقر" لکھا۔ ان کا خط پڑھنے کے بعد مجھے خیال آیا تھا کہ آں محترم عرشی ہی ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے محبت پیدا ہوگئی اور میں اپنی پہلی فرصت میں رام پور کے لیے روانہ ہوگیا۔

جون کا مہینہ تھا جو روہیل کھنڈ میں سخت گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ میرا رکشہ قلعۂ رام پور میں داخل ہوا، وہ قلعہ جہاں کبھی پرندہ بھی دم پر نہیں مار سکتا تھا، اس وقت وہاں آمد و رفت کا اس طرح سلسلہ جاری تھا، گویا وہ شہر کی عام شاہ راہ تھی۔ کوئی چوکی پہرہ نہیں، کوئی روک ٹوک نہیں۔ مرمریں مجسمے خاموش مگر ہر راہ گیر کو تکتے ہوئے۔ عمارتیں سابق مکینوں کے ذوقِ معاشرت کا آئینہ مگر حیرت میں ڈوبی ہوئی، سبزہ بیگانہ، ماحول ویرانہ۔ اس فضا میں بہت کچھ تھا۔ میں لائبریری کی عمارت میں پہنچا جو اس وقت موجودہ لائبریری کے عقب میں تھی۔ میری سب سے پہلے ملاقات لائبریری کے ایک اہل کار سے ہوئی جو بالکل گھر کے سے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ وہاں یہ وضع ہنوز قائم ہے۔ آج بھی رضا لائبریری کے تمام اہل کار ایک خاندان کے افراد معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جسم پر وردیاں نہیں، کمر میں پیٹیاں نہیں، سر پر صافے نہیں، بیٹھنے کے لیے اسٹول نہیں۔ نہ جھک جھک نہ بک بک اور نہ تضیعِ وقت کے لیے سگریٹ و بیڑی کا شغل۔ سب با ادب۔ مہمان نواز اور کم سخن۔ ان میں یہ امتیاز کرنا مشکل کہ کون چھوٹا اہل کار ہے اور کون بڑا۔ میں ایک اہل کار کے ساتھ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی آنکھوں میں چمک اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ مولویت، نظامیت اور غالبیت کا کوئی اثر ان کے چہرے یا لباس سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ رام پور کے درمیانی طبقے کے شرفا کی طرزِ معاشرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا نمونہ تھے۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی، اسی کپڑے کی شیروانی، جو اُن کی کرسی کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ ململ کی نیچی قمیص، چھوٹی موری کا پاجامہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، قریب ہی دیوار سے لگی ہوئی چوبی چھڑی جو تمام عمر ان کی رفیق و دمساز بنی رہی۔ دراز قد، چوڑا سینہ، پیشانی، آنکھیں اور ناک بہت پُرکشش۔ رنگ گورا۔ مائل بہ سرخی سیاہ داڑھی۔ بھنویں اور موئے لب بہت گھنے۔ چہرہ بہت شگفتہ، تبسم ہی تبسم۔ میں نے صفِ علما میں اس قدر شگفتہ چہرے بہت کم دیکھے ہیں۔ عرشی صاحب نے میری پذیرائی اس انداز سے کی گویا میں اردو کی بہت بڑی توپ تھا۔ دراصل ۲۸ برس کے تعلق کے بعد ہی یہ راز کھلا کہ عرشی صاحب نئی نسل کے افراد سے نیک خواہشات وابستہ کرتے اور اس طرح ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ سچ ہے بڑے وہی لوگ نہیں ہوتے جو خود بڑا کام کرتے ہیں، بڑے وہ بھی ہوتے ہیں جو دوسروں سے بڑا کام کرا لیتے ہیں۔ عرشی صاحب جوان العمر طلبا و طالبات کو دیکھ کر اسی طرح خوش ہوتے رہے جیسا کہ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ عرشی صاحب کی خوشی میں میں بھی شریک ہو گیا۔ تازہ ایم۔اے پاس لڑکوں اور لڑکیوں کی ہمت افزائی کرنا، ان کے کارِ تحقیق کو سمت دینا، ان کے خوش آئند مستقبل کے لیے دعا کرنا، میں نے مولانا عرشی سے سیکھا۔

تو ہاں مولانا عرشی بڑے پیار سے گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے تھوڑی سی دیر میں میرے خاندان، تعلیم اور ذوق و شوق وغیرہ کے متعلق مناسب واقفیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے قاضی محمد خلیل حیران بریلوی کا ذکر کیا جو قاضی محمد جمیل جنوں بریلوی تلمیذِ غالب کے خلف اور سخن سنج و سخن پرور رئیس تھے۔ قاضی خلیل نے مدرسۂ عالیہ رام پور میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کا دو سو برس پرانا خاندانی کتب خانہ گنجِ بے بہا تھا۔ مہیش پرشاد نے قاضی خلیل سے ہی جنوں بریلوی کے نام غالب کے تین خطوط حاصل کیے تھے۔ عرشی صاحب کے لیے قاضیانِ بریلی کی نسبت غالب وجہِ کشش تھی۔ عرشی صاحب نے فرمایا کہ انھوں نے قاضی محمد خلیل کی خدمت میں مکاتیبِ غالب (۱۹۳۷ء) کا نسخہ پیش کیا تھا جس کو دیکھ کر وہ زیادہ خوش نہیں ہوئے کیوں کہ ان کے خیال میں طباعت دیدہ زیب نہیں تھی۔ عرشی صاحب کی گفتگو کیا تھی، منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ انھوں نے قدرے توقف کے بعد مجھ سے لائبریری کے نوادرات دیکھنے کے لیے فرمایا اور مجھے بہ نفسِ نفیس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لائبریری کے صیغۂ مخطوطات میں پہنچادیا۔ اور پھر میں نوادرات کو دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ اپنے وجود کا بھی احساس نہیں رہا۔ وہ جب دوبارہ کمرۂ مخطوطات میں واپس آئے، میری نظر امراء القیس کے دیوان پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ مسکرائے اور اس مخطوطے کے متعلق اہم باتیں ارشاد کیں۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے کئی دیگر مخطوطات کی قدامت و اہمیت سے باخبر کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مخطوطات جن کی قرأت و مطالعہ آئندہ زندگی میں میرا اوڑھنا بچھونا بن گیا، ان کی پرکھ کا پہلا درس مجھے عرشیؔ صاحب نے دیا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رضا لائبریری رام پور میں جب کبھی مجھے کوئی مشکل درپیش ہوئی، عرشی صاحب بغایت تلطف اس کو حل کر دیتے تھے۔ مثلاً میں مخطوطات پر لگی ہوئی سلاطین، نوابین اور امرا کی مہروں کی قرأت میں بہت کمزور تھا۔ میں عرشیؔ صاحب کو مہر دکھاتا اور وہ دور سے ہی دیکھ کر اس کی تفصیل بتا دیتے تھے۔ کئی ناقص الاول و آخر خطی نسخے میں، جو داخلی و خارجی شہادتِ تحریر سے بھی محروم ہو، مہر کی قدر و قیمت کا قیاس عام لوگ بھی کر سکتے ہیں۔

کمرۂ نوادرات سے واپسی کے بعد میں نے مطلوبہ کتابیں میز پر پائیں اور میں اُن کے مطالعے میں غرق ہوگیا۔ یہاں میں یہ بھی عرض کردوں کہ عرشیؔ صاحب نے ازراہِ نوازش تمام عمر نہ تو میرے لیے میز کا علیحدہ انتظام کیا اور نہ کبھی اپنے کمرے کے باہر لکھنے پڑھنے کی اجازت دی۔ میں اول دن سے ان کے سامنے کتابیں لے کر بیٹھا اور ان کی زندگی میں یہ دستور آخر دم تک قائم رہا۔ میں اپنے کام میں مشغول رہا اور عرشی صاحب برابر پڑھتے رہے، لکھتے رہے۔ کافی دیر کے بعد جب عرشی صاحب کھڑے ہوئے، میں نے کتاب بند کی اور قلم کو میز پر رکھا۔ وہ مسکرائے۔ فرمایا ظہر کا وقت ہو چکا ہے۔ ظہر کے بعد آپ کو طعام میں شریک ہونا ہے۔ میں خاموش رہا۔ میں شرکتِ طعام سے قاصر تھا۔ عرشی صاحب نے برآمدے میں وضو کیا اور وہیں چٹائی بچھا کر نماز ظہر ادا کی۔ میں ان کو نماز پڑھتے دیکھتا رہا۔

جب میں خود نماز سے فارغ ہو کر کمرے میں واپس پہنچا، عرشی صاحب منتظر تھے۔ فرمایا "آپ ہمارا کھانا چکھیے ہم آپ کا کھانا چکھیں۔" میں نے عرض کیا "قبلہ میرے ساتھ دو ٹماٹر، ایک اُبلا ہوا انڈا اور دو ٹکڑے ڈبل روٹی کے ہیں" اور میں یہ کہہ کر بوکھلا سا گیا۔ یہ سُن کر عرشی صاحب اس طرح مسکرائے کہ ان کے موتی جیسے دانت نمایاں ہوگئے۔ فرمایا "شاید بوجہ سفر احتیاط منظور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی۔" میں نے اس کے بعد ان کی طرف نہیں دیکھا۔ بس میرے علم میں تھا کہ وہ کھانے میں مشغول ہیں اور اگر نہ معلوم ہوتا تو سمجھتا کہ وہ مطالعے میں غرق ہیں۔ دراصل آہستگی اور باقاعدگی ان کا شعارِ زندگی تھا۔ میں ۲۸ برس کے طویل عرصے میں ایک بار نہیں درجنوں بار رام پور گیا مگر میں نے ان کے طرائق اور آہستگی و باقاعدگی میں کبھی کمی نہیں دیکھی۔ عمر کے آخری دور میں جب کہ وہ پاؤں اٹھا کر چلنے سے قاصر تھے، وہ نماز بدستور کھڑے ہو کر ہی پڑھتے رہے۔ ان کے خشوع و خضوع میں بدستور فراوانی تھی۔ میرے خدا تیرے نظام میں فرق نہیں آتا۔ سورج نکلتا ہے صبح ہوتی ہے۔ سورج ڈوبتا ہے شام ہوتی ہے۔ صاحبِ سیرت بندے بھی تیرے نظام کی طرح اپنے اعمال میں مستقل ہو جاتے ہیں۔

میں تیسرے پہر تک اپنے کام سے فارغ ہوا۔ کتابیں سمیٹ کر قلم بند کیا۔ عرشی صاحب بدستور اپنے کام میں منہمک تھے۔ میں نے کچھ دیر توقف کیا کہ وہ میری طرف دیکھیں تو میں اجازتِ رخصت طلب کروں۔ وہ اپنے کام میں غرق رہے اور خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد عرشی صاحب نے میری طرف دیکھا اور فرمایا "کام ختم ہو گیا۔" میں نے عرض کیا "جی ہاں۔" فرمایا "کیا سرشار کے سلسلے میں کسی اور کتاب کی ضرورت باقی ہے۔" میں نے عرض کیا "الف لیلہ کا بولاق ایڈیشن جس کو سامنے رکھ کر سرشار نے نول کشور پریس کے لیے الف لیلہ مترجم تیار کی۔" فرمایا "اس کو تلاش کرنا ہوگا۔ میرے یہاں نہیں ہے، شاید ندوہ میں مل جائے۔ اب آپ کب تشریف لائیں گے؟" میں نے عرض کیا "انشاء اللہ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہاں تو تحقیقی کام کے لیے بہت مسالہ ہے۔" وہ مسکرائے۔ فرمایا "آپ کو ہر ممکن مدد ملتی رہے گی۔" اس کے بعد انھوں نے مصافحہ کیا اور دعا دی "اللہ توفیقِ کار عطا فرمائے۔" اس کے بعد میں ان سے رخصت ہوا۔ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

تو یہ تھی عرشی صاحب سے میری پہلی ملاقات کی روداد۔

رام پور کی عمارتوں میں اندرونِ قلعہ حامد محل سب سے زیادہ پُرشوکت عمارت ہے جس کا کلس دار گنبد شہر کے ہر کونے سے نظر آتا ہے۔ ابتدا میں رضا لائبریری حامد پیلس کے عقب میں تھی۔ رضا لائبریری ۱۹۵۲ء کو حامد پیلس میں منتقل ہوئی۔ حامد پیلس کی تزئین و آرائش اور مغربی طرز کے

© rasailojaraid.com

سنگی مجسمے دورِ ریاست کی فکر اور ذوقِ تعمیر کی یادگار ہیں۔ اس وقت قلعۂ معلیٰ میں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ اب حامد پیلس میں علم و ادب کی قندیلیں روشن ہیں۔ اب وہ دانش کدہ ہے۔ عرشی صاحب نے ۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء کو رضا لائبریری کے ناظم کی حیثیت سے اپنی خدمات کا آغاز کیا تھا جس کا اختتام ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء کو ان کی وفات پر ہوا۔ رضا لائبریری کے حامد پیلس میں منتقل ہونے کے بعد عرشی صاحب بھی ایک شان دار کمرے میں منتقل ہوئے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حامد پیلس میں ورود کے بعد عرشی صاحب کے ٹھاٹھ باٹھ میں اضافہ ہوا۔ میں عرض کروں ہرگز نہیں۔ ان کے اوضاع و اوصاف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ کتابوں کے ڈھیر میں چھپ گئے۔ کمرے میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ان کی میز پر کتابیں، الماریوں میں کتابیں، دیگر میزوں پر کتابیں، چوبی تخت، طاقوں اور دریچوں میں کتابیں۔ بس کتابیں ہی کتابیں۔ جب تک عرشی صاحب کچھ صحت مند رہے، میز پر کام کرتے رہے۔ جب نقاہت کا غلبہ ہوا، وہ بغل کی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ جب تھکن بڑھتی، وہ تخت پر لیٹ کر مطالعہ کرتے۔ کارِ تحریر و مطالعہ بہر حال جاری رہتا۔ کتابیں ان کی شان و شوکت تھیں۔ وہ حامد پیلس میں علم کا چراغ لے کر آئے جس کی روشنی میں سابقہ شوکت معدوم ہو گئی۔ اب موتیوں کو کوئی نہیں دیکھتا۔

عرشی صاحب پورا دن اس کمرے میں گزارتے۔ میں نے ان کو دیگر کمروں میں جاتے آتے نہیں دیکھا۔ لائبریری کے اہل کار اور ملنے جلنے والے عرشی صاحب سے وہیں گفتگو کرتے اور مطمئن ہو کر لوٹ جاتے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کبھی تو تو میں میں ہوئی ہو۔ ہر کام آہستگی اور باقاعدگی سے کیا جاتا۔ عرشی صاحب سے ملاقات کرنے والوں میں ایسے افراد بھی تھے جو دو چار منٹ ان کے پاس گزارنے کے لیے آتے یا ان سے مشورہ طلب کرتے۔ عرشی صاحب جیسے مصروف انسان کے لیے یہ لمحات صبر آزما ہوتے، مگر وہ کسی کو مایوس نہیں کرتے۔ خندہ پیشانی سے گفتگو فرماتے اور کبھی زیانِ وقت کی شکایت نہیں کرتے۔

ایک صاحب تشریف لائے۔ سرخ سرخ چہرہ۔ سپید داڑھی۔ تیور تیکھے۔ ٹھوڑی دو قدم آگے۔ انھوں نے بلند آواز سے سلام کیا۔ عرشی صاحب مطالعے میں محو تھے۔ انھوں نے اول چشمہ اتار کر کتاب پر رکھا، اس کے بعد سلام کا جواب دیا۔ بڑی متانت سے فرمایا: "آیئے خاں صاحب

کیسا مزاج ہے۔" خاں صاحب تو گھن گرج تھے۔ اتنے زور سے کرسی کھینچی کہ کمرے میں آواز گونج گئی۔ فرمایا " اماں ہم خرخیل ہیں یا بھڑیچ۔" عرشی صاحب کی متانت میں فرق نہیں آیا۔ وہ نپے تلے الفاظ میں خاں صاحب کا شجرہ بیان کرنے لگے اور خاں صاحب بیچ بیچ میں برابر مداخلت کرتے رہے۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد خود میں نے سکون محسوس کیا۔

ایک صاحب تشریف لائے۔ فرمایا " مولانا میں بہت پریشان ہوں۔ گھر میں طبیعت خراب ہے۔ علاج معالجے سے فائدہ نہیں ہوتا۔ کیا اب ان کو علاج کے لیے بریلی یا دہلی لے جاؤں۔" عرشی صاحب کو شاید مریضہ کی بیماری کا علم تھا۔ انھوں نے تسلی دی، امید بندھائی اور بغرض علاج دہلی جانے کا مشورہ دیا۔

ایک برقعہ پوش ضعیفہ ایک پردہ نشین لڑکی کے ساتھ آئیں۔ فرمایا " میری لڑکی نے ایم۔ اے پاس کرلیا ہے۔ آپ مشورہ دیں پڑھائی جاری رکھوں یا نہیں۔" عرشی صاحب نے بڑے محتاط الفاظ میں ضعیفہ کو تسلی دی اور اتنی اپنائیت کا اظہار کیا، گویا وہ لڑکی ان کی اپنی بیٹی تھی۔ ضعیفہ خوش خوش واپس چلی گئیں۔

ایک صاحب قدرے کم حیثیت ایک پردہ نشین لڑکی کے ساتھ تشریف لائے۔ فرمایا " میری لڑکی پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا چاہتی ہے۔" عرشی صاحب نے سکوت فرمایا۔ لڑکی نے اسی دوران غیر ضروری تفصیل کے ساتھ ایم۔ اے میں کامیابی، موضوعِ تحقیق اور متوقع نگران پروفیسر کی رائے بیان کی۔ لڑکی سیاسیات میں ایم۔ اے تھی۔ عرشی صاحب نے مجھ سے کچھ رائے طلب کی۔ میں نے موضوعِ تحقیق بدلنے کا مشورہ دیا کیوں کہ متعلقہ مواد کی تلاش میں ایک برقعہ پوش لڑکی طویل سفر نہیں کرسکتی تھی۔ اس کو زیادہ وقت کلکتہ میں گزارنا پڑتا۔ عرشی صاحب نے اتفاق کیا۔ تھوڑی دیر تک گفتگو جاری رہی۔ اس کے بعد وہ صاحب بہت مطمئن واپس چلے گئے۔

ایک مرد بزرگ لاٹھی ٹیکتے ہوئے تشریف لائے اور میرے برابر کرسی پر دراز ہوگئے۔ انھوں نے لاٹھی اتنے زور سے زمین پر رکھی کہ میں اچھل پڑا۔ چہرے مہرے سے پٹھان معلوم ہوتے تھے۔ وہ فوراً مطالعے میں مشغول ہوگئے۔ شاید وہ روزانہ ہی کسی کتاب کا مطالعہ کرنے کے لیے تشریف لاتے رہے تھے۔ اب وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد عربی عبارت بلند آواز سے پڑھتے اور فرماتے " عرشی دیکھو اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ں اختلاف کی گنجائش نہیں۔" عرشی صاحب ایک ہی جواب دیتے "جی ہاں ایسا ہی ہے۔" میں ان رگ کی وجہ سے اپنا کام مکمل نہیں کرسکا۔ کئی بار اٹھ کر گیلری میں گیا کہ شاید وہ اشارہ سمجھیں اور کوت اختیار کریں۔ مگر وہ برابر بولتے رہے۔ اور واہ رے عرشی صاحب۔ ان کی متانت میں کمی میں آئی۔ وہ بڑی فرماں برداری سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور لطف یہ کہ اپنے کام میں شغول بھی رہے۔

ایک صاحب اہلِ خانہ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ معلوم ہوا کہ ان کا وطن یونا ہے اور وہ اردو یا ہندی کسی ادبی آدمی سے بولنے میں دقت محسوس کرتے ہیں اور وہ چاہتے تھے کہ ان کو حروفِ تہجی سے عداد نکالنے کا طریقہ بتایا جائے۔ عرشی صاحب کے لیے وہ صبر آزما موقع تھا کیوں کہ زبانِ یارِ من ترکی ومن ترکی نمی دانم والی بات تھی۔ عرشی نے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ بالآخر ان صاحب نے انگریزی بولنا شروع کی اور لیجیے عرشی صاحب کی تکلیف رفع ہوگئی۔ وہ سلیس انگریزی میں حروفِ تہجی سے اعداد نکالنے کا طریقہ سمجھانے لگے۔ مجھے اس دن معلوم ہوا کہ مولانا عرشی انگریزی دان ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب اُمت کی نجات ہو جائے گی۔ میں اس دن کے بعد خود بھی عرشی صاحب سے ضرورتاً انگریزی میں بات کرلیتا جس کی ابتدا ہمیشہ میری طرف سے ہوتی۔ عرشی صاحب کی وفات کے بعد ان کے خلف اکبر میاں نے مجھے بتایا کہ وہ جرمن زبان میں بھی درک رکھتے تھے۔ آپ غور فرمائیں کہ عرشی صاحب ایک طرف عربی، فارسی، اردو، پہلوی اور عبرانی کے عالم تھے تو دوسری طرف انگریزی و جرمن زبانوں میں بھی مناسب استعداد رکھتے تھے۔ ایسا علم و فضل شاذ ہے۔ اس وقت کرامتِ مکتب اور فیضانِ نظر کی یکجائی عنقا ہے۔

عرشی صاحب کی خدمت میں زیادہ تر اساتذۂ عربی حاضر ہوتے تھے۔ گفتگو کا موضوع عربی علم و ادب ہوتا۔ کبھی کبھی بیرونِ ملک کے دوروں کا حال بھی پیش ہوتا جس سے عرشی صاحب بڑی دلچسپی لیتے۔ بعض حضرات زیرِ قلم مضامین پر گفتگو فرماتے۔ ضرورت پڑتی تو عرشی صاحب کتابیں منگوا کر بھی دکھاتے۔ وہ ماحول بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ ایک بات خاص تھی۔ عرشی صاحب کبھی بحث نہیں کرتے، اپنی بات کہہ دیتے تھے۔ بات کی تائید میں کتاب دکھا دیتے۔ اگر دوسرے صاحب گفتگو جاری رکھتے تو وہ "جی بجا ارشاد فرمایا" وغیرہ کہہ کر اپنے کام میں مشغول رہتے۔ کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات پر بحث کرنا، اپنی بات کو ضد کر کے منوانا، جذبات سے مغلوب ہونا، دوسرے کی بات کو حقیر سمجھنا عرشی صاحب کی عادت میں شامل نہیں تھا۔ جب وہ صاحب تشریف لے جاتے، عرشی صاحب ان کی غیبت میں تبصرہ نہیں کرتے۔ عرشی صاحب کسی بات پر کتنے ہی غیر مطمئن ہوں، بات کتنی ہی علمی ہو مگر وہ ان کے جانے پر ختم ہو جاتی۔ میں نے عرشی صاحب کو کبھی غیبت کے مرض میں مبتلا نہیں دیکھا۔ یہ بڑے دل گردے کی بات ہے، کیوں کہ حیثیت دار لوگ نازک مزاج ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی بات منوانا چاہتے ہیں اور بہ صورت دیگر وہ وقت بے وقت اظہارِ ناراضگی کرتے ہیں جو غیبت کی مہذب شکل ہے۔

عرشی صاحب کی گفتگو سلیس، عام فہم، بامزہ اور دلچسپ ہوتی تھی۔ وہ دورانِ گفتگو مسکراتے رہتے تھے۔ میں نے ایک بار عرشی صاحب سے کہا "قبلہ آپ ریڈیو رام پور سے تقریر کیوں نہیں کرتے لوگ آپ کو سن کر خوش ہوں گے۔" ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ فرمایا "ریڈیو والے ڈبہ لے کر کئی بار آئے مگر میں نے منع کر دیا۔ سید میاں بات یہ ہے ..." اور وہ یہ کہتے کہتے زبان داب گئے۔ جملہ میں پورا کیے دیتا ہوں۔ "سید میاں بات یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں شہرت نہیں چاہتا۔" اب آپ لفظ ڈبہ پر غور کریں جس سے مراد ٹیپ ریکارڈر تھا اور اظہارِ بیزاری کے لیے، وہ بھی خوش دلی کے ساتھ، شاید کوئی دوسرا لفظ ممکن نہیں تھا۔ دراصل عرشی صاحب خشک طبیعت نہیں تھے۔ ان کا مزاج مائل بہ مزاح تھا، مگر ان کے احباب کی تعداد محدود تھی اور وہ مزاحیہ گفتگو اپنے احباب کے درمیان ہی کیا کرتے تھے۔

عرشی صاحب جذبۂ شہرت پسندی سے عاری تھے۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا کہ وہ اپنی شہرت سے خائف ہوتے ہیں۔ میں نے پانچ چھ برس پہلے ایک ذہین طالب علم کو عرشی صاحب پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے آمادہ کیا۔ مگر میں نے عرشی صاحب کی افتادِ طبع کے پیشِ نظر ان سے ذکر کرنا بھی مناسب سمجھا اور اس کام کے لیے بہ طورِ خاص رام پور گیا، لیکن وہ آمادہ نہیں ہوئے۔ فرمایا "سید صاحب یہ کام میری زندگی میں نہ ہو تو بہتر ہے۔" میں خاموش ہو گیا۔ میں نے بعد کو ان صاحب زادے سے کہا موضوعِ تحقیق تبدیل کر دیا۔ میں سوچتا ہوں کہ عرشی صاحب کے انتقال کے بعد ان کی حیثیت اور علمی و ادبی خدمت پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا کام کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ عرشی صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی زندگی کے بہت سے گوشے، ان کا کافی علمی کام، حوالہ جات و معلومات، جو صرف ان کے ذہن میں محفوظ تھے، ان کے ساتھ قبر میں چلے گئے۔ میں یا عرشی صاحب کے دیگر احباب: اکبر میاں اور عرشی صاحب کے دیگر اہلِ خاندان، ان امور سے واقف نہیں ہو سکتے، جو صرف عرشی صاحب کے ذہن میں محفوظ تھے۔ ان کی فکر کا دھارا، ان کا ذہنی عمل اور ردِّ عمل، وہ حقائق جو ان کے تحت الشعور میں منجمد تھے، وہ امور جن کا اخفا ان کو منظور تھا، ان کے ساتھ گئے۔ اب وہ نہیں ہیں۔ اب ان سے گفتگو کے بعد وہ باتیں منظرِ عام پر نہیں آسکیں گی۔ ہمیں صرف وہ معلوم ہے جو ہم نے دیکھا اور سنا یا جو انھوں نے بتایا اور بتانا چاہا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ وہ اب قبر میں ہیں، اور ہم انسان ہیں، ہمیں الہام نہیں ہوتا۔

چوں کہ عرشی صاحب اپنے متعلق گفتگو سے بالارادہ گریز کرتے تھے، میں ان سے علوم و فنون پر نظریاتی بات نہیں کر سکا۔ میرے کان میں صرف اتنا ہی پڑا جو انھوں نے مجھ سے یادوسروں سے بیان کیا۔ میں اتنا اندازہ ضرور لگا سکا کہ وہ عربی زبان و ادب کے دل دادہ اور عربی مصنفین کے عاشق تھے۔ وہ عربی علما و فضلا کو اپنا رہنما مانتے تھے۔ نزاعی مسائل میں پڑنا اور بحث کرنا ان کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ ان کا علم، ان کا تجسّس اور ان کا جذبۂ خیر ہر نزاع کو بھاری پتھر کی طرح داب دیتا۔ وہ ہر موضوع کو علمی و تحقیقی زاویے سے دیکھتے۔ ان کا اختلاف بھی علمی ہوتا۔ وہ بحثِ عقائد، خود ساختہ نظریات اور ناواجب تقلید سے آزاد رہے۔ ان کے یہاں اچھی بات بہرحال اچھی تھی اور اچھی بری کا فیصلہ علم کی کسوٹی پر کیا جاتا۔ وہ اختلاف کے وقت شرافت اور درگزر کا سہارا پکڑتے۔ منہ بگاڑ کر بات نہیں کرتے۔ دوسرے کے قلب میں قلم کو نہیں چبھوتے۔ ان میں یہ صفت اپنے کمال پر تھی۔

ایک بار عرشی صاحب نے عرب مورخین کے تاریخ ساز کام پر اظہارِ خیال کیا۔ میں نے نہایت توجہ سے ان کی بات سنی اور میرے خیال میں یہ بات آئی کہ عرشی صاحب تاریخ کے ایسے تصوّر سے دلچسپی نہیں رکھتے جس کی تنقیح ارتقا اور تدوین میں معاشی قوتیں کارفرما ہوں۔ وہ نقدِ ادب کے لیے تاریخ کے جدلیاتی عمل کی اثر انگیزی کے بھی قائل نہیں تھے۔ ان کا نظریۂ نقد ادب علمی تنقید سے عبارت تھا جو میرے خیال میں حسبِ ضرورت ہے کیوں کہ ایک محققِ ادب کو اپنے کام کی تحقیق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں عملی تنقید سے آگے بڑھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

ایک بار جدید شاعری اور جدید غزل زیرِ گفتگو آگئی۔ میں بات کرتا رہا اور وہ مسکراتے رہے۔ انھوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ غزل کی ضرورت تغزل ہے جس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ جدید تجربات نظم میں ہونے چاہئیں۔ غزل اور موت، غزل اور اردو غزل اور تہذیب مشترک اور غیر منقسم حقائق ہیں۔ وجودیت، افادیت اور ان جیسے ہی درآمد نظریاتِ حیات و ادب سے نظم کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ غزل کا چہرہ مسخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غزل خود علامت ہے ہماری معقولیت و نامعقولیت کی، ہماری شائستگی و ناشائستگی کی اور ہر اس حالت کی جو ہم پر بہ قیدِ ہوش طاری ہوتی ہے۔ غزل کا اپنا وجود ہے مگر وہ ادب کا ایسا مقدر ہے جس میں بامرادی و نامرادی دونوں شامل ہیں۔ غزل کی اپنی تاریخ جدلیات اور معانی ہیں اور اس کی کونپلیں خود اس میں پھوٹتی رہتی ہیں۔ عرشی صاحب سنتے رہے، مسکراتے رہے۔ ان کو معلوم تھا کہ جذبہ تقاضائے فطرت ہے جس کا تعلق قلب کے اس خانے سے ہے جس میں صرف دمِ خلوص ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ نئی نسل کے لوگ جذباتی اور رجعتی واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شفقت میں طمانیت و ٹھنڈک کا خاصا تھا۔ میں نے جب ان سے عرض کیا کہ جدید شاعری مائل بہ تجرید ہے تو ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ برجستہ فرمایا۔ "سید میاں ہماری زندگی کا ڈھرّہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔"

عرشی صاحب پر ۱۹۶۳ء میں انجائنا پکٹورس کا حملہ ہوا۔ ان کو علاج معالجے سے افاقہ ضرور ہوا مگر وہ سمجھ گئے کہ اس مرض سے جاں بر ہونا مشکل ہے۔ انھوں نے اپنے کام کی رفتار تیز کر دی۔ وہ اس وقت رضا لائبریری کے عربی مخطوطات کا کیٹالاگ مرتب کر رہے تھے۔ عرشی صاحب نے اس زمانے میں چند بار مجھ سے فرمایا کہ وہ کیٹالاگ کی تکمیل کے سلسلے میں خدا سے دعا مانگتے رہتے ہیں۔ میں نے اس وقت عرشی صاحب کو بہت منہمک پایا۔ ایسا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ عرشی صاحب نے کیٹالاگ مرتب کر دیا۔ میں عرض کروں کہ یہ جان لیوا کام صرف عرشی صاحب ہی مکمل کر سکتے تھے۔ انھوں نے جیسا معیاری کام کیا، وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ یہ آج بھی باور کرنا مشکل ہے کہ کیٹالاگ کی ترتیب ایک غیر عرب نے کی ہے۔

عرشی صاحب مواد کی فراہمی میں غیر معمولی محنت کرتے تھے۔ جب تک تمام حوالے بہ دست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہو جاتے، وہ مطمئن نہیں ہوتے۔ اس کے بعد ان کا کام مقابلتاً آسان ہو جاتا۔ وہ مواد کو چھان پھٹک کر نتائج اخذ کرتے اور نتائج کو بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کرتے۔ ایسا بھی ہوا کہ مواد فراہم نہ ہونے کی شکل میں وہ ساکت ہو گئے اور بے بنیاد قیاس آرائی سے گریز کیا مثلاً "تذکرۂ محسن" کا مطالعہ کرتے وقت ان پر منکشف ہوا کہ محسن کے والد حسین شاہ حقیقت "تذکرۂ احبا" کے مؤلف تھے۔ وہ تذکرۂ احبا کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے مجھ سے زبانی کہا، بعد کو خط بھی لکھا۔ میں حسین شاہ حقیقت پر ایک مفصل مضمون "معارف" اعظم گڑھ میں شائع کرا چکا تھا اور میری دسترس تذکرۂ احبا تک نہیں ہو سکی تھی۔ کوششِ بسیار کے باوجود تذکرۂ احبا نہ عرشی صاحب کو فراہم ہوا اور نہ مجھے۔ تذکرۂ احبا مل جاتا تو اس کا تذکرۂ مصحفی سے موازنہ کرنے کے بعد مصحفی کے اس الزام کی "بے حقیقت مصحفی کا چور ہے" تحقیق ہو جاتی۔ تذکرۂ احبا سے نئی باتیں بھی معلوم ہوتیں مگر وہ نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ عرشی صاحب خاموش ہو گئے۔ میں بھی دوسرے کام میں لگ گیا۔

عرشی صاحب کچھ زیادہ ہی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ایشیا کی ایک بڑی لائبریری ان کے تصرف میں تھی۔ ان کو محنت کرنے کی عادت تھی اور وہ بہت مستقل مزاج تھے۔ ہر کام باقاعدگی و آہستگی سے انجام دیتے تھے۔ ہر وقت خود کو مشغول و منہمک رکھتے تھے۔ چنانچہ ان حالات و صفات کا نتیجہ وہ عظیم تحقیقی سرمایہ ہے جو عرشی صاحب نے مستقبل کے لیے چھوڑا۔ میں نہیں سمجھتا کہ رضا لائبریری رام پور کو عرشی صاحب جیسا ناظم اور عربی فارسی و اردو ادب کو ان جیسا عظیم المرتبت محقق ملے گا۔ میں نے عرشی صاحب اور رضا لائبریری رام پور کو ہمیشہ لازم و ملزوم سمجھا ہے کیوں کہ ایک دوسرے کی تشکیل میں دونوں کا ہاتھ ہے۔ اب یہ قرینۂ لزوم ختم ہو چکا۔ رضا لائبریری رام پور عرشی صاحب کے لیے تاقیامت گریہ کرے گی۔

عرشی صاحب یونیورسٹی کی سطح پر تحقیقی کام سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ تازہ ایم۔ اے پاس لڑکے اور لڑکیاں یا جوان العمر لکچرار اپنے تحقیقی مقالے کی تیاری کے سلسلے میں رضا لائبریری رام پور آتے ہی رہتے اور ان کی ملاقات عرشی صاحب سے لازماً ہوتی ہی تھی مگر ان کی مثال ان بچوں سے دی جا سکتی ہے جن کے منہ سے ابھی شیرِ مادر چھوٹا ہو۔ ان کے نگران پروفیسر کو اتنی فرصت نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر سکتے آئیں، بعض حالات میں بچوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کون سی کتاب حوالے کے لیے از حد ضروری ہے اور کس کتاب کو ہاتھ نہیں لگانا ہے۔ اس پر قرأتِ مخطوطات مستقل دردِ سر۔ چنانچہ صلاحیت، جوش و جذبہ اور عرشی صاحب کے تعاون کے باوجود بعض طلبا و طالبات آغازِ سفر میں بھاگ کھڑے ہوتے، بعض ڈیڑھ دو برس کے بعد بھی چھوڑ دیتے، بعض سخت جان آبلہ پا ہو کر دم توڑ دیتے۔ مشکل سے ہی کوئی لوٹ پیٹ کر تحقیقی مقالہ مکمل کر پاتا۔ ایسی افراتفری میں رجسٹریشن سے پہلے تحقیقی کام کی مشق کرنا ضروری ہے، خواہ وہ ایم فل کی صورت میں ہو یا چار چھ تحقیقی مقالات کی اشاعت کی شکل میں۔ نگراں پروفیسر کو لازم ہے کہ وہ ہر قدم پر رہنمائی کرے۔ میں بعض اوقات یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ موضوعِ تحقیق کے رجسٹریشن کے وقت خود نگران پروفیسر کی صلاحیتِ تحقیق کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام، محمد اکرام، مولانا غلام رسول مہر اور عبداللطیف بجنوری نے غالب پر جتنا کام کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ پروفیسر کا پچھلا نہیں لگا ہے۔ معیاری تحقیقی کام یونیورسٹی کے باہر بھی ہوا اور ہوتا رہے گا۔ یونیورسٹی سے باہر کے لوگ تحقیقی کام کرنے والوں کو سہارا بھی دیتے رہتے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ ضرورت مناسب تحقیقی صلاحیت اور تحقیقی مزاج کی ہے جس کو خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ عرشی صاحب ہمیشہ "تحقیقی مزاج" کی ہی بات کیا کرتے تھے جس سے وہ خود بدرجۂ اولیٰ متصف تھے۔

اس وقت علاقائی ادب، ادبی تحریکات، لسانیات اور مقامی بولیوں وغیرہ) پر بھی تحقیق کام کی ضرورت ہے۔ یہ کام مشکل نہیں۔ میں نے جب کوہستانِ کماؤں کی مقامی بولی الموڑیا پر کام کا آغاز کیا تو اس کی تکمیل تک مجھے کیسے پاپڑ بیلنا پڑے۔ میرا دل جانتا ہے۔ عرشی صاحب نے اردو پر پشتو کے اثرات کا جائزہ لیتے وقت کتنی راتیں بے خواب گزاریں، ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔ مگر اس کے بغیر تحقیق کا کیا لطف؟

مقصود تو معیاری تحقیق ہونا چاہیے نہ کہ ڈگری۔ ڈگری تو معیاری تحقیق کا انعام ہے۔

وہ دن تھا ۲۶ اکتوبر [illegible] کا۔ میں رامپور پہنچا۔ ۱۸۵۷ء کے ایک مجاہدِ آزادی مفتی عنایت احمد کاکوروی کے متعلق مجھے مستند حوالوں کی جستجو دامن گیر تھی۔ میرے ہمراہ حکمت قریشی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلمہا بھی گئیں، جن کا مولانا حسن رضا خاں احسن بریلوی پر لکھنؤ یونیورسٹی کے لیے تحقیقی مقا
آخری منزل میں تھا۔ عرشی صاحب بالکل ویسے ہی تھے جیسا کہ میں نے ان کو گزشتہ ملاقات کے
وقت دیکھا تھا۔ ان کی صحت میں ایسی تبدیلی نہیں تھی کہ فکر لاحق ہو۔ عرشی صاحب نے مجھ سے
کرسی نزدیک لانے کے لیے کہا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے دنیا جہان کی با
کرتے رہے۔ میری صحت اور علاج کے متعلق بھی کرید کرید کر دریافت کیا۔ دواؤں کے نام تک
دریافت کیے۔ میں نے تفصیل کے ساتھ علاج و پرہیز کے متعلق بتایا، جو انھوں نے نہایت تو
سنا۔ اس کے بعد فرمایا "خود کو مشغول رکھیے۔ معمولات میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ اس میں بہ
فائدہ ہے۔ میں خود بھی اس پر عمل کرتا ہوں۔" اٹھائیس برس کے تعلق میں نہ تو عرشی صاحب
نے کبھی مجھ سے کرسی کو قریب لانے کے لیے کہا اور نہ کبھی مسلسل ڈیڑھ گھنٹے گفتگو فرمائی۔ س
ہے آنے والے واقعات اپنا سایہ پہلے سے ڈالتے ہیں!

عرشی صاحب کی نظر نکہت سلمہا پر پڑی جو اپنے کام میں منہمک تھیں۔ فرمایا "ماشاء اللہ
آج کل لڑکیاں خوب ترقی کر رہی ہیں۔ ہمارے یہاں تحقیقی کام کے سلسلے میں لڑکیاں برابر آتی رہتی
پہلے یہ بات نہیں تھی۔" میں نے عرض کیا "اس کی کامیابی کے لیے دعا فرمائیں، کام ختم کر چکی ہے
جواب میں فرمایا "ان شاء اللہ بہ درجہ اولیٰ کامیابی ملے گی۔ آپ ڈاکٹر گر بھی ہیں۔" یہ "ڈاکٹر گر
کی ترکیب عرشی صاحب کی اختراع تھی جو وہ میرے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہاں ان کا مفہو
نکہت سلمہا کے تحقیقی کام کی نگرانی و رہ نمائی سے تھا۔

اس کے بعد عرشی صاحب نے مجھ سے کام کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ ایک
مضمون میں فٹ نوٹ دینے کے لیے مفتی عنایت احمد کے متعلق مختصر مگر مستند معلومات درکا
ہیں۔ عرشی صاحب نے سکوت فرمایا اور غور کیا، پھر وہ اٹھے اور اپنے کمرے کی ہی ایک الماری
سے مولانا عبدالحی کی نزہت الخواطر لائے اور مفتی عنایت احمد پر مشتمل اوراق کھول کر کتاب مجھ
دے دی۔ میں نے چند بار ان اوراق کا مطالعہ کیا اور پندرہ سولہ سطروں میں نوٹ تیار کر کے عرشی
صاحب کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کیا کہ وہ اس کی صحت پر نظر ڈال دیں، کیوں کہ میری استعداد عر
نہ ہونے کے برابر ہے اور مجھ سے غلطی ہو سکتی ہے۔ عرشی صاحب نے نوٹ کا مطالعہ کیا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصلاح واپس کر دیا۔ اس نوٹ کا اختصار میرے مضمون "گل دستہ ہوش افزا بریلی" مطبوعہ معارف اعظم گڑھ اپریل ۱۹۸۱ء میں شامل ہے۔

اس کے بعد عرشی صاحب عربی و سنسکرت کی تعلیم، زبان و ادب اور رضا لائبریری رام پور میں ان کے ذخائر پر گفت گو کرتے رہے۔ بات ملا فیضی تک پہنچی۔ میں نے نل دمن کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ لائبریری میں نسخہ موجود ہے۔ میں نے جائسی کی پدماوت کے متعلق پوچھا، کیا کوئی فارسی رسم الخط میں ملتا ہے۔ فرمایا کہ کتب خانے میں ایسا نسخہ ہے۔ بعدہٗ علاء الدین خلجی، رانی پدمنی، چتوڑ پر حملہ، جوہر کی رسم، شیر شاہ سوری، ملک محمد جائسی اور پدماوت پر تاریخی و ادبی گفتگو ہوتی رہی۔ آج بھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس دن عرشی صاحب سے کتنی طویل گفتگو ہوئی۔ مگر یہ آخری گفت گو تھی۔

عرشی صاحب خاموش ہو گئے۔ کچھ غنودگی طاری ہوئی۔ میں دبے پاؤں کرسی سے اٹھا۔ نکہت سلمہا کے کام کا جائزہ لیا اور اس کے بعد خود بھی آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ شاید سو بھی گیا، کیوں کہ میں جب نماز ظہر اور دوپہر کے کھانے کے لیے اٹھا تو آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔

خیر۔ ساڑھے تین بجے تک جملہ کاموں سے فراغت میسر ہوئی اور میں نے عرشی صاحب سے اجازتِ رخصت طلب کی۔ انھوں نے حسبِ روایت مصافحہ کیا اور فرمایا "فی امان اللہ" نکہت سلمہا نے سلام کیا اور طالبِ دعا ہوئیں۔ عرشی صاحب نے ان کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور دعا دی "اللہ مزید توفیقِ کار عطا فرمائے۔"

پھر میں نے چلتے چلتے مُنہ پھیر کر عرشی صاحب کو دیکھا، وہ اپنے کام میں مشغول ہو چکے تھے۔

میں فروری ۱۹۸۱ء میں زیادہ بیمار تھا۔ میری دنیا اپنے کمرے تک محدود تھی۔ نہ اخبار نہ ریڈیو نہ کتابیں۔ عیادت کرنے والوں کی صورت دیکھ کر اپنی حالت کا اندازہ کرتا رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ بلڈ پریشر نارمل ہوا۔ اعصابی ہیجان میں کمی ہوئی، گہری نیند آنے لگی، کمزوری رفع ہوئی، تھوڑا بہت چلنے پھرنے لگا۔ ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء کو نکہت سلمہا نے بلوایا، انکار نہ کر سکا۔ ان کے برادرِ خُرد کے ساتھ سواری پر چلا گیا۔ ان کے یہاں پہنچ کر بیٹھا ہی تھا کہ ان کی چھوٹی بہن ٹرانسسٹر لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں اور گھبرا کر کہا "عرشی صاحب وفات پا گئے" میں نے آنکھیں بند کر لیں نکہت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سما سسکیاں لے کر رونے لگیں۔ ریڈیو رام پور سے عرشی صاحب کی تدفین کا آنکھوں دیکھا حال نشر ہو رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ میں نے خود کو اس حادثے کے لیے تیار کر لیا تھا، بالکل اسی طرح جیسے میں نے خود کو اپنی موت کے حادثے کے لیے تیار کیا تھا۔ بس ایک ذہنی تربیت جو موت کو بار بار یاد کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک خیال کہ موت تو آنا ہی ہے، دمِ واپسیں سے قبل زندگی کو کیوں اجیرن کیا جائے۔ کم سے کم ایک تصور کہ موت کا وقفہ انسان کو عاقبت کی ابدیت میں داخل کر دیتا ہے۔

میں کافی دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ چشمِ تصور میں عرشی صاحب کی تصاویر ابھرتی رہیں، قلب ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتا رہا۔

عرشی صاحب کی موت کا حادثہ گزر گیا۔ میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ عرشی صاحب کا انتقال ہوا ہی نہیں ہے۔ جب دو ڈھائی ماہ کے بعد سفر کے قابل ہوا، رام پور پہنچا۔ لائبریری میں قدم رکھنے کے بعد چاروں طرف دیکھا۔ ہر شے اپنی جگہ پر تھی۔ وہی فضا، وہی ماحول۔ ایک پرانے اہل کار نے چند قدم آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ ان کی آنکھوں میں سوگواری تھی۔ میں بوجھل قدموں سے اکبر میاں کے پاس چلا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں عرشی صاحب کے کمرے میں نہیں گیا۔ میرے پاؤں میری زندگی میں کٹ گئے۔

اکبر میاں گیلری میں بیٹھے تھے۔ ان کے تصرف میں وہ چھوٹی پرانی میز اور دو پرانی کرسیاں تھیں، جو عرشی صاحب کھانا کھاتے وقت استعمال کرتے تھے۔ میں ایک کرسی پر دراز ہو گیا۔ دوسری کرسی پر کراچی سے آئے ہوئے ایک مہمان بیٹھے ہوئے تھے اور تاریخ روہیلہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اکبر میاں نے عرشی صاحب کے مرض و وفات کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ موت تو آنا ہی تھی، آج نہیں تو کل۔ عرشی صاحب خوش نصیب تھے کہ چلتے ہاتھ پاؤں اٹھ گئے۔ انسولین مقدار میں زیادہ جسم میں پہنچ گئی، یہ بہانۂ موت تھا۔ تیمارداروں کی مت کٹ گئی اور وہ گلوکوز نہ دے سکے، یہ موت کی بالادستی کا ثبوت تھا۔ المختصر عرشی صاحب نے آنکھیں بند کیں اور وہ ابدی نیند سو گئے۔

میں نے عرشی صاحب کے کمرے میں جھانکا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ البتہ عرشی صاحب کی کرسی خالی تھی۔ پل بھر یہ محسوس ہوا کہ عرشی صاحب وضو کرنے کے لیے بغل والے کمرے میں گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا میں اس کمرے میں بیٹھ کر کبھی لکھ پڑھ سکوں گا؟ چراغ تو بجھ چکا مجھے اندھیرے میں کیا دکھائی دے گا۔

میری طبیعت اکھڑ رہی تھی۔ میں عرشی صاحب کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ پایانِ کار میں نے کراچی سے آئے ہوئے مہمان سے درخواست کی کہ وہ مجھے عرشی صاحب کی قبر پر لے چلیں۔ وہ آمادہ ہو گئے اور میں ان کے ہمراہ مزارِ عرشی پر حاضر ہوا۔

حامد پیلس کے مغربی پہلو میں ایک قطعۂ اراضی مدت سے خالی پڑا تھا میرے دیکھتے دیکھتے بس اس میں اتنی تبدیلی ہوئی کہ زیرِ دیوار حصار ہائیدل کی ایک تنصیب کا اضافہ ہوا۔ عرشی صاحب نے بھی اس قطعۂ اراضی کو روزانہ دیکھا ہوگا کیوں کہ قلعۂ معلی کے مغربی دروازے سے ہی وہ آتے جاتے تھے۔ اس قطعۂ اراضی میں ہی عرشی صاحب کی آخری آرام گاہ ہے۔ دیکھیے اس کو سقف کب میسر ہو۔ احاطۂ نظام الدین دہلی میں غالب کی کھلی قبر کو بھی ایک زمانے کے بعد سقف میسر ہوئی۔

میں دس فروری ۱۹۸۲ء کو ریڈیو رام پور کے بلاوے پر رام پور گیا۔ اول لائبریری میں حاضری دی اور بعد کو کافی دیر تک عرشی صاحب کی قبر کے سامنے کھڑا رہا۔ صدرِ قبر پر جنگلی گیندا اگ آیا تھا۔ اہلِ بصیرت کے لیے قبر مقامِ عبرت ہے مگر مکینِ قبر؟ — عرشی صاحب اہلِ جستجو کے لیے مینارۂ نور ہیں۔

ضمیمہ

عرشی صاحب پر مضمون مکمل کرنے کے بعد میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان کی حیات اور دیگر ضروری امور کے متعلق ایک ضمیمہ بھی ہم رشتہ ہونا چاہیے تاکہ قارئین کے سامنے ان کی پوری تصویر آجائے۔ لہٰذا میں نے اکبر علی خاں عرشی زادہ کے تعاون سے یہ ضمیمہ تیار کر دیا۔

"نذرِ عرشی" اور ان کے "خاکۂ حیات" کے علاوہ میرے پیشِ نظر وہ سوال نامہ بھی ہے جو کسی صاحب نے عرشی صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور عرشی صاحب نے اس کا تحریری جواب دیا۔ اکبر میاں کی عنایت سے سوال نامے اور جوابات کی نقل ہم دست ہوئی جو میرے پاس محفوظ ہے۔

نام محمد امتیاز علی خاں۔ تخلص عرشی۔ والد ماجد کا نام محمد مختار علی خاں (ڈاکٹر ویٹرنری سرجن)،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والدہ ماجدہ کا نام چھمی بیگم۔ دادا کا نام محمد اکبر علی خاں (محدث رام پوری)۔ اجداد کا تعلق سوات کے قبیلے حاجی خیل سے تھا، جو اٹھارویں صدی عیسوی میں ترکِ وطن کرکے رام پور وارد ہوئے۔ پیدائش پنج شنبہ ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ۔ مطابق ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء۔ جائے پیدائش مکان آبائی محلہ پھلواڑ رام پور۔ (جانب غرب قلعۂ معلیٰ رام پور)

شادی ماجدہ بیگم سے ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ سات لڑکے اور دو لڑکیاں تولد ہوئیں۔ تعلیم آنرز عربی ۱۹۲۴ء۔ آنرز فارسی ۱۹۲۵ء۔ انٹرنس انگریزی۔ تینوں امتحانات لاہور یونیورسٹی سے پاس کیے۔ بعد کو مدرسۂ عالیہ رام پور سے اعلیٰ سند حاصل کی۔

ملازمت۔ ۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء کو بہ حیثیت ناظم رام پور رضا لائبریری رام پور تقرر ہوا۔ دورانِ ملازمت انڈین ہسٹری کانگریس، انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن، ادارۂ اسلامیہ لاہور، انجمن ترقی اُردو اور کل ہند اردو کانگریس، حیدرآباد دکن میں ریاست رام پور کی نمائندگی کی۔

رام پور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا جس میں عرشی صاحب حصہ لیتے۔ انھوں نے اپنے سب سے پہلے مضمون کے متعلق فرمایا "میں نے سب سے پہلا مضمون غالب کے اس شعر پر لکھا:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

اور یہ مضمون رسالہ نیرنگ رام پور میں چھپا تھا۔"

[رسالہ نیرنگ رام پور کے مدیر منشی عزیز اللہ خاں عزیز تھے۔ منشی عزیز، غالب کے طرزِ شعر گوئی کے دل دادہ اور رام پور کی ادبی محافل کے روحِ رواں تھے۔ منشی عزیز کی علالت کی وجہ سے عشرت رحمانی نے رسالہ نیرنگ کا اجرا دہلی سے کیا۔ عرشی صاحب اپنے ماموں مولوی احمد جان خاں آثر اور منشی عزیز اللہ خاں عزیز کے ہمراہ ننھے صاحب (نواب زادہ شبیر علی خاں بہادر ولد نواب کلب علی خاں بہادر) کے یہاں ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔]

عرشی صاحب نے اپنی نثر گوئی کے متعلق فرمایا "میں نثر نگاروں میں سرسید، شبلی اور ابوالکلام سے متاثر ہوا ہوں۔"

عرشی صاحب نے اپنی شعر گوئی کے متعلق فرمایا "جی ہاں۔ اب بھی کبھی کبھی نواسۂ سروش آنے لگتی ہے مگر یہ سب دل کا بہلاوا ہے۔ ویسے دوسروں کے بھی اچھے شعر مجھے اتنے ہی عزیز معلوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتے ہیں جتنے اپنے کیے ہوئے بلکہ اپنوں سے بڑھ کر۔ ہاں اس معاملے میں تلمیذ رحمٰن ہوں، کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔"

"... اور شاعروں میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کا خوشہ چیں ہوں۔ فارسی میں سعدیؔ، حافظؔ اور غالبؔ کا دل دادہ ہوں اور سبک ہندی کو فارسی شاعری کا معراج مانتا ہوں۔ اس اظہار کے ساتھ یہ اقرار بھی ضروری ہے کہ بقول سعدیؔ:

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم"

عرشی صاحب نے غالب پر مزید تحقیقی کام کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا "میری ناقص رائے میں غالب کی نظم و نثر فارسی و اردو پر ان کے انگریز دوستوں کی تنقید کا اثر ایسا موضوع ہے جس پر کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ اس پر کسی ماہر غالبیات پر قلم اٹھانا چاہیے۔ نیز غالب کے کلیات فارسی کے مسودے تلاش کرنا چاہئیں جن میں غالب نے اپنے فارسی کلام میں بار بار ترمیم و اصلاح کر کے اسے موجودہ شکل تک پہنچایا۔"

نذر عرشی میں نگارشات عرشی کے عنوان پر عرشی صاحب کی کتب کی فہرست شائع ہوئی ہے۔ ذیل میں صرف ان کتابوں کی فہرست دی جاتی ہے جو اردو سے متعلق ہے۔ ان میں وہ کتب اعداد بھی شامل ہیں جن کے ساتھ ہندی، پشتو، فارسی اور عربی کے اعداد (پیراگراف) شامل ہیں۔

۱۔ مکاتیب غالب ۱۹۳۷ء
۲۔ ترجمہ مجالس رنگیں ۱۹۴۲ء
۳۔ دستور الفصاحت ۱۹۴۳ء
۴۔ نادرات شاہی ۱۹۴۴ء
۵۔ فرہنگ غالب ۱۹۴۷ء
۶۔ سلک گوہر ۱۹۴۸ء
۷۔ نادرات بیگمات ۱۹۵۲ء
۸۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی ۱۹۵۵ء
۹۔ دیوان غالب نسخۂ عرشی ۱۹۵۸ء
۱۰۔ اردو اور افغان ۱۹۶۳ء

© rasailojaraid.com

۱۱۔ فہرست مخطوطاتِ اردو جلد ۱ — ۱۹۶۶ء
۱۲۔ مقالاتِ عرشی — ۱۹۷۰ء
۱۳۔ استنادِ نہج البلاغہ — ۱۹۷۲ء

عرشی صاحب نے اردو، فارسی اور عربی زبان و ادب کی جو خدمت کی، اس کے صلے میں ان کو بہت نوازا گیا ہے۔ تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

یونیسکو کے تحفظِ مخطوطات کے سیمینار کابل (۱۹۶۷ء) اور یومِ خوش حال خاں خٹک کابل (۱۹۶۸ء) میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ علم الہند کے ماہرین کے وفد کے ممبر کی حیثیت سے ۱۹۵۸ء میں روس کا دورہ کیا۔ کل ہند اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے ۱۹۶۶-۶۷ء میں صدر رہے۔

اسلامیہ اورینٹل بورڈ حیدرآباد دکن۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ۔ مجلسِ انتظامیہ مطلع العلوم رام پور۔ کل ہند غالب صد سالہ تقریب کمیٹی دہلی اور اسلامک اسٹڈیز کانفرنس علی گڑھ کے ممبر تھے۔ صولت پبلک لائبریری رام پور کے بانی ممبر تھے۔ جامعہ اردو علی گڑھ۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ اور اردو اکیڈمی اتر پردیش لکھنؤ کے سابق ممبر تھے۔

ریاست رام پور کا ادبی انعام مبلغ یک ہزار (۱۹۳۶ء)۔ حکومت ہند کا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ مبلغ پانچ ہزار (دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی پر ۱۹۶۱ء)۔ صدر جمہوریہ ہند کی سندِ اعزاز برائے اعلیٰ خدمات ادبیاتِ عربی۔ مبلغ پانچ ہزار سالانہ تاحیات (۱۹۷۲ء)۔ حکومت اتر پردیش کا مجموعی خدمتِ ادب کے لیے انعام مبلغ پانچ ہزار (۳-۱۹۷۴ء) اور غالب اکیڈمی ایوارڈ۔ بعد وفات۔ مبلغ تین ہزار (اردو نثر پر ۱۹۸۱ء) عطا ہوئے۔

مالک رام۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (وغیرہ) پر ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی، جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صدر جمہوریہ ہندوستان تھے۔ کمیٹی کی جانب سے ایک یادگار تحقیقی کتاب "نذرِ عرشی" عرشی صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی (۱۹۶۶ء)۔ عرشی صاحب سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے "نذرِ عرشی" معتبر وسیلہ ہے۔

عرشی صاحب نے ۲۴/۲۵ فروری ۱۹۸۱ء کی درمیانی شب میں ۲½ بجے وفات پائی۔ ۲۵ فروری کی شام کو بعد مغرب قلعۂ معلیٰ رام پور کے شمال مغربی گوشے اور رام پور رضا لائبریری رام پور کے زیرِ سایہ مدفون ہوئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com